ڈاکٹر معین الدین عقیل

بی ۱۵/۲۱۵، گلستان جوہر، کراچی ۷۵۲۹۰

اودھ کی تاریخ وتہذیب کے بنیادی مآخذ

(نمائندہ خودنوشت سوانح عمریوں کا ایک مطالعہ)

Dr. Moinuddin Aqeel

B-215/15,Gulistan-e Jaohar, Karachi 75290

Basic Sources of History and Culture of *Awadh*

(A Study of Selective Autobiographies)

In British India, the State of 'Awadh' had a Unique Identity in its Literary and cultural activities. It was a renowned hub of Cultural Values. There are many sources which tell us about the History of this State but the most authentic source is autobiographical writings. These writings show not only the biographical details of the author but also portray the actual face of the society. This article is a study of these sources and their importance.

دور مغلیہ کے عہد آخر اور برطانوی حکومت کے عہد آغاز میں، برعظیم میں جو ریاستیں وجود میں آئیں، حیدرآباد کے بعد اور اس سے قطع نظر، ریاست اودھ ہی ہے جس میں علمی اور ثقافتی سرگرمیاں نسبتاً زیادہ دیکھنے میں آئیں۔ یا پھر بھوپال اور رامپور میں بھی یہ وصف قدرے نمایاں رہا۔ علم، ادب اور فن تمام شعبوں میں تخلیقی، ثقافتی اور تصنیف وتالیف کا عمل وہاں عروج پر رہا اور ادیبوں، شاعروں، فن کاروں اور علماء نے حکمرانوں کی علم وفن سے مثالی دل چسپی اور سرپرستی کے باعث اپنی علمی وتخلیقی صلاحیتوں اور اپنے فنی تجربوں اور استعداد کے نتیجے میں اپنے اپنے مثالی جوہر اس طرح دکھائے کہ فن اور ادب نے وہاں ترقی کی وہ منزلیں طے کیں جو اس عرصے (۱۷۲۱۔۱۸۵۶ء) میں سارے برعظیم میں کہیں اور اس قدر دیکھنے میں نہ آئیں۔

زبان اور ادب میں فارسی اور اردو دونوں ہی کو وہاں عروج حاصل رہا۔ فارسی اگرچہ ہندوستان کے عام حالات اور انگریزوں کی لسانی حکمت عملیوں کے تحت، زوال پذیر تھی لیکن علم وادب میں سرگرمیوں کا بڑا انحصار اب بھی فارسی ہی پر تھا اور

انیسویں صدی کے آخر تک رہا۔ اردو زبان، خاص طور پر اردو شاعری کا، یہ اولین دورِ عروج تھا اور ریاست کی خوش حالی اور حکمرانوں کی سرپرستی ہی تھی کہ جس نے برعظیم کے تمام خطوں سے فن کاروں اور علماء کی طرح شاعروں کو بھی یہاں یکجا کر رکھا تھا۔ شاعری میں لب و لہجے اور مزاج وموضوعات کی وہ صفات یہاں عام ہوئیں جن کے نتیجے میں ان صفات کے باوصف، یہاں تخلیق پانے والی شاعری اور اس کے مزاج واسلوب کو ''دبستانِ لکھنؤ'' سے موسوم کیا گیا۔

اردو سے قطع نظر، جس کی حیثیت اور اہمیت کو مستقبل میں یہاں مزید فروغ حاصل ہونا تھا، فارسی میں تصنیف و تالیف اور شعر گوئی کی روایت کو بھی، ریاست کے سقوط تک اور بعد میں بھی ایک عرصے تک عروج حاصل رہا، اس کی ماضی کی مستحکم حیثیت کو ابھی، خصوصاً علمی معاملات میں اور سرکاری معاملات میں بھی یکسر زوال کا سامنا نہ کرنا پڑا۔ عام زندگی میں تو اردو کا رواج عام ہو چکا تھا لیکن علمی، سرکاری وانتظامی معاملات میں فارسی زبان ہی استعمال میں تھی۔ شعر وادب میں بھی یہ کم وبیش اسی طرح وسیلہ بنی رہی، جس طرح ماضی میں تھی۔ بالعموم شاعر تو ذولسانی ہی تھے اور وہ دونوں ہی زبانوں میں شعر کہتے رہے لیکن متعدد شعراء نے فارسی کو ترجیح دینے کا رویہ تبدیل نہ کیا۔ جیسے قاضی محمد صادق اختر، مرزا محمد حسن قتیل، غلام علی آزاد بلگرامی، سراج الدین علی خان آرزو، شیخ علی حزیں یہ وہ شاعر ہیں، جن کے زمانے میں اور جن کے آس پاس اردو شاعری کا چرچا اور رواج شروع ہو چکا تھا، لیکن انھوں نے فارسی ہی پر انحصار کیے رکھا۔ چناں چہ اودھ میں فارسی شاعری بھی سقوط کے عرصے تک اردو کی ہمسری کرتی رہی۔ (۱) نثر میں فارسی دانی اور تصنیف وتالیف کے لحاظ سے قتیل بہت ممتاز ہوئے، جو بقول عبدالحلیم شرر ''کمال فارسی دانی کے شوق ہی میں مسلمانوں ہوئے تھے''۔ (۲) اور اس حد تک لیاقت پیدا کر لی تھی کہ اہل زبان بھی رشک کریں۔ لکھنو کی فارسی زبان و ادب سے نسبت کو شرر نے اپنی تصنیف ''گزشتہ لکھنؤ'' میں نہایت جامعیت سے پیش کیا ہے۔ (۳) فن انشاء کو یہاں بہت عروج حاصل ہوا اور اس فن پر یہاں متعدد اہم کتابیں تصنیف ہوئیں، جو نصابوں میں پڑھائی جانے لگیں، جیسے ''انشائے فائق''، (۴) اور ''رقعات چھمی نرائن''۔ (۵)

تاریخ نویسی میں بھی یہاں وقیع کام دیکھنے میں آتے ہیں۔ ناگزیر کتابوں میں کمال الدین حیدر کی ''قیصر التواریخ''، اصلاً فارسی ہی میں تھی، (۶) جس کا اردو ترجمہ بعد میں دو جلدوں میں شائع ہوا۔ (۷) ''عماد السعادت'' مصنفہ غلام علی خان، سعادت علی خان کے عہد (۱۷۹۷ء-۱۸۱۴ء) تک ریاست اودھ کی مستند اور معروف تاریخ ہے، جو ۱۸۰۸ء میں لکھی گئی تھی۔ (۸) اودھ کی تاریخ پر مجموعی اور پھر ہر حکمراں کے عہد پر مخصوص فارسی اور اردو تاریخوں کی ایک بہت بڑی تعداد موجود ہے، (۹) لیکن زیادہ مستند تاریخیں فارسی ہی میں لکھی گئیں۔ مگر یہاں صرف ایسی منتخب تصانیف کا ذکر مقصود ہے، جن میں مصنفین نے اپنا ذاتی احوال بھی تحریر کیا ہے، یا جو خود نوشت سوانح کے ذیل میں بھی آتی ہیں۔ جیسے رجب علی بیگ سرور کی تصنیف ''فسانۂ عبرت''، (۱۰) ہے، جو سرور کی اس اعتبار سے اہم تصنیف ہے کہ اس میں اودھ کے آخری چار حکمرانوں اور ان کے عہد کے چشم دید حالات پیش کیے گئے ہیں۔ اپنے موضوعات اور مندرجات کے لحاظ سے یہ تصنیف دوسری معاصر تصانیف سے یوں مختلف،

ممتاز اور منفرد ہے کہ اس میں محض سیاسی نشیب و فراز ہی نہیں، معاشرتی اور ثقافتی زندگی اور حالات کے تعلق سے ذاتی احساسات وجذبات کی عمدہ عکاسی و ترجمانی بھی نظر آتی ہے، جن کا اہتمام بالعموم ہماری تاریخوں میں نہیں کیا جاتا تھا۔ لیکن یہ روایت تاریخ کی تقریباً ہر کتاب میں نظر آتی ہے کہ مصنف جزوی طور پر آغاز میں یا خاتمے میں یا جہاں وہ ضرورت محسوس کرے، اپنے حالات یا اپنا یا اپنے اجداد کا ذکر مختصر ہی سہی، کرتے رہے ہیں اور یہ روایت ہر دور اور ہر علاقے کے مورخین یا مصنفین کے ہاں بالعموم نظر آتی ہے۔ لکھنو سے متعلق ہر تاریخ، مثلاً کمال الدین حیدر کی ''قیصر التواریخ'' اور ''سوانحات سلاطین اودھ''(۱۱) اور ''عماد السعادت'' اس کی نمایاں مثالیں ہیں۔ یہی اہتمام ''تاریخ فرح بخش'' مصنفہ فیض بخش کاکوروی (۱۲) میں زیادہ بہتر صورت میں نظر آتا ہے جو اودھ کے تین حکمرانوں شجاع الدولہ، آصف الدولہ (۱۷۷۵ء۔۱۷۹۵ء) اور سعادت علی خاں (۱۷۹۸ء۔۱۸۱۴ء) کے عہد کا احاطہ کرتی ہے۔ چوں کہ فیض بخش عمائدین لکھنو کی مصاحبت اور آصف الدولہ کی والدہ بہو بیگم (متوفی ۱۸۱۶ء) کی ملازمت میں رہے اس لیے انھوں نے ذاتی معلومات اور چشم دید واقعات کو بیان کرتے ہوئے اپنی اس تصنیف کو اودھ کی تاریخ کے ایک اہم ماخذ کی حیثیت دے دی۔

فیض بخش ایک کثیر التصانیف مصنف تھے۔ ان کی ایک اور کتاب ''چشمۂ فیض'' بھی فارسی میں تھی، جس میں انھوں نے ذاتی و نسبی حالات اور اودھ کے تاریخ حالات تحریر کیے تھے۔ اور چوں کہ وہ بہو بیگم کی ملازمت میں تھے اس لیے ان معلومات تک ان کی رسائی ہوگئی تھی، جو عام مؤرخ کے علم میں نہیں آسکتی تھیں۔ چناں چہ ان کی یہ تصنیف بھی خود نوشت سوانح عمری کے ذیل میں دراصل مبسوط ہو کر اودھ کی تاریخ کا ایک بنیادی ماخذ بن گئی ہے۔ یہ کتاب شائع نہیں ہوئی۔ فیض بخش کی یہ دونوں تصانیف اروان کی ایک بیاض کاکوری کے ایک کتب خانے میں محفوظ ہیں۔ (۱۳) ان کے علاوہ اس مصنف کی ایک اور تصنیف ''رسالہ دراحوال زمینداران کاکوری'' بھی غیر مطبوعہ ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ کے کتب خانے میں محفوظ ہے، جس میں مصنف نے اپنے ذاتی حالات کے ساتھ ساتھ اپنے اعزاء اور دوستوں کے حالات بھی تحریر کیے تھے، جو لکھنو، فیض آباد اور دوسرے اضلاع سے تعلق رکھتے تھے۔ (۱۴)

تواریخ میں اپنے حالات لکھنے کی روایت مزید مصنفین کے ہاں بھی بالعموم دیکھی جاسکتی ہے۔ مثلاً حاتم علی بیگ مہر نے، جو ایک عرصے تک لکھنو میں مقیم رہے، اپنی تصنیف ''ایاغ فرنگستان'' (۱۵) میں، جو اودھ اور دیگر مقبوضات شمالی ہند پر مقامی حکمرانوں، انگریز حکمرانوں اور افسروں کے احوال پر مشتمل تھی، خود اپنے حالات اور خصوصاً جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے دوران رونما ہونے والے واقعات کو بھی، جو خود مصنف پر بھی گزرے، بیان کیے۔ (۱۶)

''تاریخ فرح بخش'' کی طرح ''تاریخ حسینیہ'' بھی فارسی میں اودھ کی تاریخ ہے، جو ''تاریخ فرح بخش'' کی طرح معروف نہیں، لیکن اس کے مصنف نواب حسین علی خاں نے اسے کسی انگریز حکمراں کی فرمائش یا خوشنودی کے لیے، جس طرح متعدد دسری تاریخیں لکھی گئی تھیں، تصنیف نہیں کیا تھا اور نہ یہ کسی انگریز افسر کو کسی انعام یا صلے کی لالچ میں پیش کی گئی

تھی۔۔۔چناں چہ اس میں تاریخ کو بڑی حد تک غیر جانب دارانہ لکھنے کی کوشش صاف نظر آتی ہے۔(۱۷) یہ تصنیف اودھ کی تاریخ کے ایک بنیادی اور اہم ماخذ کی حیثیت رکھتی ہے اور اس لحاظ سے اہم ہے کہ اس کے مصنف کو اودھ کے حکمراں طبقے سے قرابت داری رہی، چناں چہ اس کی معلومات اور مشاہدات، سرکاری اور معاشرتی دونوں حلقوں میں، راست اور اہم ہیں۔ یہیں وہ درباروں اور ریاست کے حالات تحریر کرتے ہوئے خود اپنے اور اپنے اسلاف کے حالات کو بھی بیان کرتا ہے۔۔۔اور اس لحاظ سے یہ تصنیف بھی خودنوشتہ سوانحی مواد پر مشتمل ہے۔

یہی حیثیت ''تاریخ اقتداریہ'' کی بھی ہے، جس کے مصنف مہدی علی خاں تخلص حسن اور خطاب اقتدار الدولہ، محتشم جنگ، ضیغم جنگ تھا اور امرائے دربار اودھ میں شامل تھے۔ یہ تصنیف جو ۱۸۶۳ء میں لکھی گئی تھی اور دو ضخیم جلدوں اور سولہ سو صفحات پر محیط تھی، شائع نہیں ہوئی۔ یہ اردو میں ہے اور اس کا مخطوطہ سنٹرل لائبریری (کتب خانہ آصفیہ) حیدرآباد میں محفوظ ہے۔(۱۸) اسے اودھ کی نہایت معتبر اور جامع تاریخ سے موسوم کیا گیا ہے کہ جس میں بیان کردہ واقعات اور حالات یا تو بزرگوں سے سنے گئے تھے یا خود مصنف کے علم میں۔اور چشم دید تھے۔

کتب تواریخ کی طرح سوانحی مواد اور خصوصاً خودنوشت سوانح کے طور پر جزوی یا تفصیل سے، سفرناموں میں بھی بکثرت ملتا ہے اور کم از کم سفر کی مناسبت اور حوالے سے خود سفرنامہ نویس کی زندگی سفرنامے میں محفوظ ہو جاتی ہے۔ پھر اس سے بڑھ کر بعض سفرنامہ نویسوں نے اپنے سفر کے پس منظر میں اس کی تیاری اور پھر درمیان میں جہاں جہاں ضرورت محسوس ہوتی اپنا ذاتی احوال اپنے اجداد اور خاندان کا ذکر بھی شامل کرتے رہے ہیں۔اس قسم کے سفرناموں میں، لکھنؤ سے تعلق رکھنے والے مصنفین یا وہاں سے تعلق رکھنے والے سفرناموں میں ابوطالب اصفہانی کا سفرنامہ ''مسیر طالبی فی بلاد افرنجی''(۱۸) سب سے اہم ہے کہ مصنف کا تعلق اودھ کے طبقۂ امراء اور انگریزوں سے یکساں تھا۔ اس نے زندگی کے ابتدائی اہم ایام لکھنؤ میں گزارے اور جب اس نے اپنے سفر یورپ کا احوال اپنے سفرنامے میں تحریر کیا تو اس کی معرفت لکھنؤ سے خاصی نمایاں رہی اور اس میں لکھنؤ یا اودھ کا تذکرہ بھی جستہ جستہ بیان ہوتا رہا۔اس سے قبل منشی اعتصام الدین کا سفرنامہ ''شگرف نامۂ ولایت'' ایسا اولین سفرنامہ تھا جس میں لکھنؤ کا ذکر بھی جزوی تذکرے کی حد تک موجود ہے۔(۱۹) یہ دونوں سفرنامے، بلکہ اگر اس میں ایک اور ابتدائی نو دریافت سفرنامۂ منشی اسمٰعیل کو بھی جو ۱۷۷۳ء میں لکھا گیا تھا، شامل کیا جائے تو یہ تینوں سفرنامے یورپ سے متعلق تھے جن میں سے اول الذکر دو کے مصنفین کا تعلق لکھنؤ سے رہا، تیسرا مصنف بنگال سے تعلق رکھتا تھا اور اس کا سفرنامہ ''تاریخ جدید'' صرف بنگال اور یورپ تک محدود یا مخصوص تھا۔(۲۰) ان تینوں مصنفین نے اپنے ذاتی حالات اپنے ان سفرناموں میں تحریر کیے تھے۔

ایسے سفرنامے، جو برعظیم ہی سے متعلق ہیں، ان میں ''واقعات اظفری'' ہے جس کے مصنف ظہیر الدین علی بخت اظفری نے کچھ عرصہ لکھنؤ میں بھی گزارا تھا۔(۲۱) اس کی یہ تصنیف ۱۲۱۱ھ/۱۷۹۴ء سے ۱۲۲۱ھ/۱۸۰۴ء کے درمیان کے

واقعات کا احاطہ کرتی ہے۔اس کے آس پاس کے عرصے میں دو ایرانی سیاحوں نے بھی ہندوستان کا سفر کیا تھا اور لکھنو بھی پہنچے تھے اور وہاں کے حالات اور مشاہدات اپنے سفر ناموں میں بیان کیے تھے۔ان میں سے ایک میر عبداللطیف خاں شوستری اور دوسرا اس کا معاصر احمد بہبہانی تھا۔ان کے سفر نامے، علی الترتیب ''تحفۃ العالم''(۲۲) اور ''مراۃ الاحوال جہاں نما''۔(۲۳) غیر جانب دارانہ اور معاصر مآخذ کی حیثیت رکھتے ہیں۔

ان سفر ناموں سے قدرے مختلف ایک تصنیف ''سوانح لکھنو'' ہے جو اس کے مصنف نجات حسین خاں کا سفر نامہ اور روز نامچہ ہے۔۱۸۴۳ء میں مصنف نے اپنے وطن پٹنہ سے خاص لکھنو کا سفر کیا اور تقریباً ڈھائی مہینے وہاں قیام کیا۔وہاں ان کے جو کچھ معاملات رہے اور جو حالات وواقعات کا مشاہدہ انھوں نے کیا، اسے ''سوانح لکھنو'' میں قلم بند کیا۔یہ تصنیف فارسی میں تھی اور تا حال غیر مطبوعہ ہے اور پٹنہ یونیورسٹی کے کتب خانے میں محفوظ ہے۔(۲۴) یہ تصنیف ایسے سفر ناموں میں شامل ہے جو اگر چہ حالات سفر کو تحریر کرنے کے مقصد سے وجود میں آتے ہیں لیکن خود مصنف کے حالات بھی ان میں نمایاں رہتے ہیں۔ایسی ہی ایک تصنیف ''سفیر اودھ''(۲۵) بھی ہے جس کے مصنف مسیح الدین علوی ریاست اودھ کی جانب سے سرکاری ذمے داری پر لندن جاتے ہیں اور وہاں قیام کرتے ہیں۔ان کی یہ تصنیف ان کے اپنے حالات اور ریاست اودھ کے معاشرتی اور سیاسی معاملات اور برطانیہ کے حالات کے تعلق سے بے حد معلوماتی ہے اور اپنے موضوعات کے لحاظ سے تاریخ اودھ کے اہم ماخذ کی حیثیت رکھتی ہے۔

ایسی تصانیف جو روز نامچوں کے انداز اور اسلوب میں لکھی گئیں، دیگر نوعیت کے بنیادی مآخذ کی طرح یکساں مفید ہوتی ہیں۔بلکہ استناد کے لحاظ سے بالعموم تاریخ وار ہونے کی وجہ سے زیادہ معلوماتی اور حوالہ جاتی اہمیت اختیار کر جاتی ہیں۔اس طرح کے روز نامچوں یا وقائع کو تاریخ وار لکھنے کی روایت بہت قدیم اور مستحکم رہی ہے۔یہی وقائع نویسی یا روز نامچہ نویسی، اخبار نویسی کے زمرے میں بھی شمار ہوتی رہی ہے جو اگر چہ مقاصد کے لحاظ سے مختلف ہو سکتی تھیں لیکن ان کا طرز اور اسلوب قریب قریب یکساں ہوتا تھا۔مغلیہ عہد میں اس قسم کی روایت بہت مستحکم اور منظم رہی، چناں چہ ایسے مجموعے، قلمی اور مخطوطات کی شکل میں، جن میں سے کچھ مکمل یا جزوی طور پر شائع بھی ہوئے مختلف کتب خانوں، عجائب خانوں اور دستاویزات کے ذخیروں میں محفوظ ہیں۔لکھنو یا اودھ کے تعلق سے بھی ایسے وقائع اور روز نامچے سرکاری وقائع نویسوں سے قطع نظر دیگر مصنفین یا شائقین کی توجہ اور کوششوں سے مرتب ہوتے رہے۔ان کی ایک اولین مثال مرزا ابو طالب اصفہانی کے تحریر کردہ وقائع ''تفضیح الغافلین''(وقائع زمان نواب آصف الدولہ)(۲۶) ہے جسے مصنف نے ۱۷۹۴ء میں مرتب کیا تھا۔مصنف انگریزوں کے بہت قریب رہا اور اسی نسبت سے اسے دربار اودھ میں انگریزوں کے گماشتے کی حیثیت حاصل رہی۔یہ وقائع بھی اس نے ایک انگریز افسر کی ہدایت پر تحریر کیے تھے۔انشاء، شاعری اور روداد نویسی میں اسے مہارت تامہ حاصل تھی، چناں چہ اس کا سفر نامہ مذکورہ بالا ''مسیر طالبی'' اور اس کی دیگر تصانیف اس کی مثال ہیں۔یہ وقائع جہاں دربار اودھ اور اس کے معاملات ومعمولات کی

عکاسی کرتے ہیں وہیں معاشرتی زندگی، ذاتی محسوسات ومشاہدات اور واقعات کو بھی ترتیب سے پیش کرتے ہیں۔اس لحاظ سے یہ تصنیف ایک ناگزیر ماخذ کی حیثیت کی حامل ہے۔

ان روزناچوں میں، جس کی ایک مثال ''تفضیح الغافلین'' ہے، سید حسن لطافت کا مرتبہ ''فرمان سلیمانی'' بھی اس حوالے سے لائق ذکر ہے۔ یہ روزنامچہ مرزا سلیمان شکوہ برادر واجد علی شاہ کے معمولات روز وشب سے متعلق ہے۔ جسے ان کے استادِ سخن اور مصاحب سید حسن لطافت نے تحریر کیا تھا۔ یہ ۲۰ مارچ سے ۱۳ جون ۱۸۸۲ء کے ایام پر مشتمل ہے۔اور اس میں مرزا سلیمان شکوہ کی محفلوں، صحبتوں، مشاعروں اور مصروفیات کا احوال روزنامچے کی صورت میں ترتیب سے لکھا گیا ہے۔اس میں لکھنوی معاشرت، معمولات زندگی، ثقافتی ومجلسی سرگرمیوں اور وہاں کی متعدد شخصیات کے بارے میں مفید معلومات فراہم کرتا ہے۔ یہ غیر مطبوعہ ہے اور انجمن ترقی اردو کے ذخیرۂ مخطوطات میں قومی عجائب گھر کراچی میں محفوظ ہے (۲۷) اشاعت کے لیے اسے مشفق خواجہ نے اپنے تحریر کردہ تعارف اور تعلیقات کے ساتھ مرتب کیا تھا لیکن مشفق خواجہ کے انتقال (۲۰۰۵ء تک) یہ شائع نہیں ہوا تھا، جو ۲۰۰۶ء میں مجلّہ ''جریدہ''، شعبہ تصنیف وتالیف جامعہ کراچی شمارہ ۳۷ میں شائع ہوا۔

واجد علی شاہ کی متعدد تصانیف میں، جو خود ان کی تحریر کردہ ہیں، ان کے سوانحی حالات جستہ جستہ شامل ہیں۔ان کی بعض تصانیف روزنامچے کی تعریف میں بھی آتی ہیں جیسے ''تاریخ پری خانہ''، مرتبہ ۱۲۶۵ھ/ ۱۸۴۸ء جسے ''محل خانہ شاہی'' کے نام سے فدا علی خنجر نے فارسی سے ترجمہ کر کے فروری ۱۹۱۴ء میں مرتب کیا تھا (۲۸) اس تصنیف میں واجد علی شاہ نے اپنی عشقیہ زندگی، اپنے معاشقوں اور اپنی بیگمات کے بارے میں اپنے تاثرات اور خیالات تحریر کیے تھے۔اس تصنیف کو تحسین سروری نے فارسی نثر سے فدا علی خنجر کے اردو ترجمے سے، لاعلمی میں اردو ترجمہ کر کے ''پری خانہ'' کے نام سے شائع کیا تھا (۲۹) دونوں کے متن میں قدرے فرق موجود ہے۔تحسین سروری کو اس کا قلمی نسخہ انتظام اللہ شہابی کے کتب خانے میں دستیاب ہوا تھا۔خود نوشت کے ضمن میں واجد علی شاہ کی تصنیف ''بنی'' (۳۰) بھی ان کے حالات، مشاہدات اور تجربات کے تعلق سے قیمتی اور دل چسپ معلومات فراہم کرتی ہے۔اس طرح کی معلومات ان کی مزید تصانیف، خاص طور پر ان کی محبوباؤں اور بیویوں کے نام تحریر کردہ ان کے مکاتیب کے مجموعوں میں بھی ملتی ہیں۔نثر کے علاوہ ان کی منظوم تصانیف میں ان کی مثنوی ''حزن اختر'' مثالی ہے جو تفصیل سے ان کے دور ابتلاء اور قید وبند کے حالات کو موثر صورت میں پیش کرتی ہے۔ (۳۱)

''تاریخ پری خانہ'' کی طرح روزنامچے جس کی ایک اور مثال ''فرمان سلیمانی'' ہے، یہ دونوں لکھنو کے شاہی محلات اور طبقۂ امراء سے متعلق ہے۔ روزناچوں کے بارے میں ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی نے تو سید مظہر علی سندیلوی کے روزنامچے ''ایک نادر روزنامچہ'' (۳۲) کی اشاعت ثانی (۳۳) کے مقدمے میں تحریر کے سن آغاز کی وجہ سے اس کا اردو کا اولین روزنامچہ قرار دیا ہے۔ جو ۱۸۶۷ء سے ۱۹۱۱ء تک لکھا جاتا رہا۔اس میں اگرچہ لکھنو کے حالات بھی۔۔۔جگہ جگہ تحریر کیے گئے ہیں لیکن روزنامچہ نویس نے دنیا بھر کے حالات اور خود اپنے ذاتی وخاندانی احوال بھی تفصیل سے درج کیے ہیں۔سندیلوی نے

اپنی خودنوشت سوانح عمری بھی تصنیف کی تھی جو ۱۸۹۴ء میں سندیلہ سے شائع ہوئی تھی (۳۴) اس کا دوسرا اگلہ حصہ بھی انھوں نے ۱۹۰۴ء میں لکھنا شروع کیا تھا لیکن ان کے روزنامچے سے اس کی اشاعت کا ۱۹۱۱ء تک علم نہیں ہوتا۔ اسی سال ۲۴/ دسمبر کو ان کا انتقال ہو گیا۔ (۳۵)

روناچوں، سفرناموں، تذکرہ اور تاریخوں سے قطع نظر، جن میں مصنفین کے ذاتی وسوانحی خودنوشتہ حالات کی بنیاد پر، مصنفین کے بارے میں وہ ایک بنیادی ماخذ کی حیثیت میں اپنی ایک اہمیت رکھتے ہیں لیکن ان میں تفصیل موجود نہیں ہوتی۔ لیکن مستقل سوانح عمریوں کے لکھے جانے سے یہ کمی باقی نہ رہی۔ مستقل بنیادوں پر خودنوشت سوانح عمری لکھنے کی روایت اردو میں ۱۸۲۰ء میں شروع ہوئی تھی جب پتمبر سنگھ نے اپنی خودنوشت یادداشتیں تحریر کیں۔ (۳۶) یہ روایت وسط انیسویں صدی کے بعد قدرے عام ہوتی نظر آتی ہے۔ لیکن ان ابتدائی آپ بیتیوں کا تعلق اودھ یا لکھنو سے نہیں تھا۔ فارسی میں یہ روایت موجود تھی اور اردو میں اس روایت کے آغاز کے باوجود، انیسویں صدی کے اختتام تک برقرار رہی۔ ابتداً شیخ علی حزیں کی خود نوشت سوانح ''تاریخ احوال تذکرۂ حال'' (۳۷) اودھ سے اس کے جزوی تعلق کی بنیاد پر اولین حیثیت رکھتی ہے، جو ۱۷۴۱ء میں مکمل ہوئی تھی۔ اودھ کے اس وقت کے حکمراں شجاع الدولہ نے حزیں کی سرپرستی کی تھی ورنہ حزیں کا قیام زیادہ تر بنارس میں رہا۔ وہ ۱۷۶۶ء تک حیات رہا لیکن اس نے اپنی سوانح میں اضافہ نہ کیا۔ میر تقی میر کی خودنوشت ''ذکر میر'' بھی اختتامی حصے میں اودھ اور لکھنو کے کچھ حالات پر مشتمل ہے، جب میر نے آصف الدولہ کی مصاحبت میں کچھ وقت گزارا اور لکھنو میں وارن ہیسٹنگز کے استقبال کے مناظر دیکھے تھے۔ یہ خودنوشت ۱۷۸۸ء تک کے حالات کا احاطہ کرتی ہے۔ (۳۸) یہ میر کے ایک اور معاصر محمد بخش آشوب نے بھی ایک آپ بیتی ''سوانح احوال آشوب'' اپنے انتقال ۱۷۸۴ء سے قبل تحریر کی تھی۔ مصنف عماد الملک غازی الدین خاں کی ملازمت میں بیس سال تک میر منشی کے عہدے پر فائز رہا اور پھر بعد میں آصف الدولہ کے دربار سے منسلک ہوا اور چھ سات سال تک خدمات انجام دیں۔ اس کی آپ بیتی اس عہد کے تاریخی حالات سے اسی طرح مزین ہے جس طرح ''ذکر میر'' ہے۔ (۳۹)

ایک مکمل اور مستقل سوانح عمری ''ذکر میر'' کے بعد ایک صدی تک محمد کاظم کی تحریر کردہ سوانح عمری کے علاوہ، کوئی اور دستیاب نہیں جس کا تعلق لکھنو سے ہوا اور جو فارسی میں لکھی گئی ہو۔ محمد کاظم نے اپنی سوانح عمری ۱۳۰۵ھ/ ۱۸۸۸ء میں ذکر میر کے ٹھیک ایک سو سال بعد تحریر کی تھی، جو لکھنو سے مطبع منشی گنگا پرساد ورما برادران سے ۱۳۰۸ھ/ ۱۸۹۱ء میں شائع ہوئی۔ ''ذکر میر'' اور ''محمد کاظم کی ''سوانح عمری'' کے درمیانی سو سالہ عرصے میں متعدد سوانح عمریاں تو دستیاب ہیں لیکن فارسی زبان میں اور لکھنو سے متعلق کوئی مکمل مثال موجود نہیں۔ اردو میں اس عرصے میں چند خودنوشت سوانح عمریاں لکھی گئیں لیکن ان کا تعلق لکھنو سے نہیں۔ ہاں شعراء نے اردو میں لکھنو کے تعلق سے مختلف نوعیت کی منظومات تخلیق کیں، جن میں لکھنو کی تباہی و بربادی پر لکھے گئے شہر آشوب کی ایک خاصی بڑی تعداد بطور مثال موجود ہے (۴۰) یا پھر طویل مثنویاں، جیسے ''افسانۂ

لکھنؤ'' (۱۲۹۰ھ/ ۱۹۰۷ء) از آغا زجو شرف [۴۱] اور ''شفاالدولہ کی سرگزشت'' (۱۸۵۷ء) [۴۲] جو ان حوالوں سے نمائندہ تخلیقات ہیں۔ ان دونوں طویل مثنویوں میں جہاں ذاتی احوال قدرے تفصیل سے بیان کیا گیا ہے، وہیں لکھنؤ کے زوال اور اس کی تباہی و بربادی کا بھی تفصیل سے ذکر شامل ہے۔ آغا جو شرف نے اپنی ایک دوسری مثنوی ''شکوہ فرنگ'' میں بھی اپنے کچھ حالات اختصار سے نظم کیے تھے۔ [۴۳] دیگر شعراء کے ہاں بھی ان پر گزرے ہوئے حالات یا افتاد کا ذکر ان کی نظموں میں ملتا ہے۔ [۴۴]

محمد کاظم کی مذکورہ ''سوانح عمری'' مطبوعہ ہونے کے باوجود کمیاب ہے اور شاذ و ہی کسی کتب خانے میں دستیاب ہے۔ لکھنؤ میں مسعود حسن رضوی ادیب کے ذخیرے میں محفوظ ہے۔ راقم الحروف کے کتب خانے میں بھی یہ موجود ہے۔ اس کی ایک نقل مشفق خواجہ نے راقم سے ۱۹۸۱ء میں حاصل کی تھی۔ وہ اس وقت سید حسن لطافت کا مرتبہ روزنامچہ ''فرمان سلیمانی'' مرتب کر کے شائع کرنے کا منصوبہ بنا رہے تھے اور اس مقصد کے لیے اودھ پر مآخذ کتب کی تلاش میں رہتے تھے۔ اسی طرح متعدد کمیاب کتابوں کے عکس انھوں نے راقم سے بنوائے تھے۔ محمد کاظم کی ''سوانح عمری'' کا عکس حاصل کرنے کے بعد وہ اس کوشش میں تھے کہ کسی کو اس کے اردو ترجمے پر آمادہ کریں تا کہ اس کا اردو ترجمہ شائع ہو کر استفادۂ عام میں بھی آ جائے۔

ہم دونوں اس بات پر متفق تھے کہ یہ ''سوانح عمری'' اودھ اور لکھنؤ کے تہذیبی اور معاشرتی مآخذ کے طور پر بہت اہم ہے۔ اس زمانے میں اس موضوع پر ان سے گفتگوئیں رہتی تھیں لیکن پھر راقم الحروف کی ملک سے ۹ سال کی غیر حاضری کے دوران اس بارے میں کیا پیش رفت ہوئی اس کا علم نہ ہو سکا اور نہ پھر کبھی اس موضوع پر کوئی گفتگو چھڑی۔ چند ماہ قبل مشفق خواجہ کے انتقال کے بعد ان کے بردار خورد خواجہ طارق نے اطلاع دی کہ مرحوم کے کاغذات میں ایک ''سوانح عمری'' کا مسودہ اردو میں دستیاب ہوا ہے جو معلوم نہیں کس کی تحریر ہے؟ وہ دریافت کرتے رہے کہ اس کا مترجم کون ہو سکتا ہے؟ میں نے دو ایک حضرات کے امکانی نام دہرائے اور پھر خود ان حضرات سے دریافت کیا لیکن انھوں نے لاتعلقی ظاہر کی۔ افسوس کہ خواجہ صاحب مرحوم نے اردو ترجمے کا مسودہ کسی سے وصول کیا اور اس پر ۱۲۵ کتوبر ۱۹۸۲ء کو وصولی کے دستخط کیے لیکن یہ نہ لکھا کہ کس سے وصول کیا؟ مسودے پر کہیں کوئی نشاندہی بھی نہیں ہوتی کہ کچھ سراغ لگ سکے۔ بہر حال یہ ترجمہ شعبۂ تصنیف و تالیف کراچی یونیورسٹی کے مجلّے ''جریدہ''، شمارہ ۳۷ میں شائع ہوا۔ چناں چہ لکھنؤ کی تاریخ و تہذیب کے ایک چشم دید بنیادی ماخذ کی حیثیت میں یہ ''سوانح عمری'' اردو میں منتقل ہو جانے کے باعث محققین کے ایک بڑے حلقے کے لیے معاون ثابت ہوئی ہے۔

آغاز میں راقم الحروف نے یہ عرض کیا ہے کہ لکھنؤ اور اودھ پر مآخذ کتب کی کمی نہیں۔ ہر موضوع، ہر عہد اور ہر پہلو پر معاصر کتب موجود ہیں لیکن ان میں محمد کاظم کی اس تصنیف کو کئی امتیاز حاصل ہیں۔ مصنف نے آغاز میں اپنے ذاتی و خاندانی حالات، دیگر مصنفین کے مقابلے میں قدرے تفصیل سے بیان کیے ہیں اور غرض و غایت بھی مصنف کے پیش نظر اپنی سوانح تحریر کرنا تھا۔ جس وقت (۱۳۰۵ھ/ ۱۸۸۸ء) اس نے یہ سوانح لکھی ہے، اس کی عمر ابتداء میں خود اس کے بیان کے مطابق ستر سال سے تجاوز کر چکی تھی، جس کے مطابق اس کی پیدائش کا سن ۱۸۱۸ء کے لگ بھگ متعین ہوتا ہے لیکن متن میں ایک جگہ اس نے ۱۲۳۲ھ/ ۱۸۱۵ء کو اپنی پیدائش کا سن بتایا ہے۔ جو درست لکھا ہے۔ اس اعتبار سے اس کتاب کی تصنیف کے وقت اس کی

عمر ۳۷ برس تھی۔ ''سوانح عمری'' کی تکمیل بلکہ طباعت کے وقت وہ بھٹوامئو کے راجا کاظم حسین خاں کی ملازمت میں بحیثیت طبیب تقریباً بیس سال سے منسلک تھا۔ اس کے بعد اس کے حالات کا علم نہیں ہوتا۔ کتاب پر قطعۂ تاریخ میرزا محمد عباس ہوش نے تحریر کیا ہے، جو شاعر کے علاوہ غالباً ناول نویس بھی تھے۔ ان کے دو ناول ''افسانۂ نادر جہاں''(۴۵) اور ''ربط ضبط'' کا تذکرہ اردو ناول نگاری کے ایک مؤرخ اور نقاد اور خود افسانہ نگار علی عباس حسینی نے کیا ہے۔(۴۶)

اس کتاب کی تصنیف کے وقت تک فارسی میں خاص لکھنؤ کے تعلق سے لکھی جانے والی اس نوعیت کی کسی اور خود نوشت سوانح عمری کا علم نہیں ہوتا۔ اردو میں مستقل سوانح عمری کی یہ روایت بنگال میں ۱۸۲۰ء میں شروع ہو چکی تھی۔ لیکن شمالی ہند میں اس کا آغاز ۱۸۶۲ء میں نظر آتا ہے۔(۴۷) پھر محمد کاظم کی اس ''سوانح عمری'' کے لکھے جانے کے عرصے میں اردو میں عبدالغفار نساخ(۴۸) اور جعفر تھانیسری(۴۹) کی خود نوشت سوانح عمریاں لکھی جا چکی تھیں(۵۰) ان سوانح عمریوں سے انیسویں صدی کے معاشرتی اور سیاسی حالات کی ایک حقیقی تصویر سامنے آتی ہے اور یہ یقین کیا جا سکتا ہے کہ چوں کہ ان سوانح عمریوں کی تصنیف کا مقصد، اس وقت کی عام تاریخوں کی مانند کسی حکمراں، نواب یا رئیس کو خوش کرنا یا اس کی فرمائش پورا کرنا نہ تھا کہ یہ مصلحتوں کے تابع رہ کر لکھی جاتیں، اس لیے ان میں بیان کردہ واقعات کی صحت کو مشکوک قرار نہیں دیا جا سکتا۔ ہاں ذاتی عصبیت اگر کسی کے پیش نظر رہی ہو تو اسے بعید از امکان نہیں کہا جا سکتا۔

ان سوانح عمریوں میں محمد کاظم کی تصنیف، لکھنؤ کے دربار، سیاسی حالات کے نشیب و فراز اور حکمرانوں کے معمولات کے ساتھ ساتھ علمی و تہذیبی اعتبار سے بھی اہم ہے۔ مصنف نے ان حالات و واقعات کو بیان کرنے کے علاوہ اپنے معاصر شعراء اور اطباء اور علماء کا ذکر بھی کیا ہے اور ان سے بالمشافہ ملاقاتوں کے تعلق سے مفید معلومات بھی فراہم کی ہیں۔ اودھ کے حکمرانوں، ان کے مشاغل و معمولات اور ان کے محلات کے بارے میں بھی مصنف نے ایسی معلومات درج کی ہیں جو اس وقت کی عام تاریخوں اور کتابوں میں نہیں ملتیں۔ اسی طرح جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے دوران لکھنؤ کی بربادی کو جس تفصیل سے مصنف نے بچشم خود دیکھ کر تحریر کیا ہے وہ بہت اہم اور مستند ہے۔ یہ غالباً واحد ایسی تصنیف ہے جو واجد علی شاہ کی شخصی اور انتظامی کمزوریوں اور خامیوں کو بھی سامنے لاتی ہے اور ریاست کی تباہی و بربادی کا ایک بڑا سبب اس کی بداعمالیوں اور عاقبت نااندیشیوں کو قرار دیتی ہے۔ مصنف نے ریاست کے زوال کے جو اسباب متعین کیے ہیں وہ عبرت انگیز اور افسوس ناک ہیں۔ یہ سب کچھ پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ مصنف نے جو کچھ دیکھا، سنا اور محسوس کیا اسے بلا کم و کاست بیان کر دیا ہے۔ اس کے علاوہ جہاں اس نے ثقافتی اور معاشرتی زندگی کی جھلکیاں پیش کی ہیں، وہ بھی بے حد پر کشش، دل چسپ اور تاریخی اہمیت کی حامل ہیں۔

ان مناسبتوں اور خصوصیات کے باعث لکھنؤ اور اودھ کے تعلق سے لکھی جانے والی یہ ''سوانح عمری'' انفرادیت اور اہمیت کی حامل ہے اور اس میں پیش کردہ واقعات اور حالات کی وجہ سے اس کو ایک بنیادی ماخذ کی حیثیت میں مفید اور ناگزیر سمجھنا چاہیے۔ اودھ کے مآخذ تہذیب و تاریخ میں یہ کتاب ایک اہم اضافہ ہے، جو فارسی میں رہنے کی وجہ سے اور کمیاب

ہونے کے سبب استفادۂ عام میں نہ تھی، لیکن اب اردو میں ترجمہ ہونے کے باعث یہ عام استفادہ میں بھی آ سکے گی۔

لکھنو کی تاریخ وتہذیب کے خودنوشتہ سوانحی مآخذ میں ''فرمان سلیمانی'' اور ''سوانح عمری'' کے مصنفین سید حسن لطافت اور محمد کاظم دونوں ہم عصر ہیں، ایک ہی معاشرے، ماحول اور عہد کے پروردہ بھی ہیں اور دونوں قریب قریب ایک ہی وقت اپنی اپنی یاداشتیں تحریر کرتے ہیں اور ادب وشعر کا یکساں ذوق رکھتے ہیں۔ یہ تصانیف، ایک نے تقاضائے منصب و ضرورت اور دوسرے نے تقاضائے فطرت کے تحت تحریر کیں، لیکن ہمارے لیے لکھنو کی تاریخ وتہذیب اور سیاست ومعاشرت کے بنیادی مآخذ فراہم کر دیے جن کی اہمیت اور قدر و قیمت سے کوئی صرف نظر نہ کر سکے گا۔

ان دونوں میں اشتراک کے پہلو تو یہ ہیں کہ دونوں اپنے اپنے دائرے میں لکھنوی معاشرت اور تاریخ وتہذیب اور حالات وواقعات کو پیش کرتے ہیں۔ لیکن ایک بڑا فرق ان دونوں میں یہ ہے کہ ایک کا دائرہ وسیع تر ہے، یعنی محمد کاظم نے نہ صرف اپنے اجداد اور خود اپنے خاندانی وذاتی حالات کو موضوع بنایا بلکہ اپنی زندگی کے تفصیلی حالات اور اپنے عہد کے سیاسی و معاشرتی واقعات، ثقافتی اور علمی احوال، شخصیات اور انسانی زندگی کے رشتوں اور المیوں سب ہی کو موضوع بنایا جب کہ ''فرمان سلیمانی'' محض ایک شخص مرزا سلیمان شکوہ کے معمولات زندگی، مشاغل اور ان کے متعلقات کا احاطہ کرتی ہے۔ ایک کا دائرہ اور ماحول وسیع ہے اور دوسرے کا اس میں بیان کردہ تفصیلات اور جزئیات کے باوجود محدود ہے۔ اس لحاظ سے ان دونوں کے اشتراک اور اختلاف کے باوجود یہ دونوں تصانیف لکھنو کی تاریخ وتحقیق کے خودنوشتہ سوانحی مآخذ کے طور پر ناگزیر بھی ہیں۔

حوالہ جات/حواشی

۱۔ اس حوالے سے ایک اچھا جائزہ ''اودھ کے فارسی گوشعراء'' مصنفہ زہرا فاروقی، (دہلی، ۲۰۰۳ء) میں دیکھا جا سکتا ہے۔

۲۔ ''گزشتہ لکھنو''، مرتبہ محمد اکرام چغتائی (لاہور، ۲۰۰۶ء)، ص ۱۳۷

۳۔ ص ۱۳۹۔۱۴۱

۴۔ مصنف: غلام محمد فائق، اصلاً ''دستورالانشاء معروف بہ انشائے فائق'' (کانپور، ۱۸۵۰ء)۔

۵۔ مرتبہ: منشی فیض بخش کاکوروی (مطبع حسنی، ۱۲۶۰ھ)۔

۶۔ سی اے اسٹوری (C.A.Storey)، Persian Literature: A Bio- Biblographical Survey.، جلد اول، حصہ اول (لندن، ۱۹۵۳ء) ص ۱۰۷

۷۔ نولکشور، لکھنو، ۱۸۷۹ء

۸۔ مطبوعہ، نولکشور، ۱۸۶۴ء

۹۔ ان کا ایک مجموعی لیکن سرسری جائزہ ''اودھ کے تاریخ نگار'' مصنف انور حسین اکبر پوری (لکھنو ۱۹۹۱ء) میں دیکھا جا سکتا ہے۔

۱۰۔ اشاعت اول، لکھنو ۱۸۸۴ء اشاعت دوم، مرتبہ مسعود حسن رضوی ادیب (لکھنو، ۱۹۵۷ء)۔

۱۱۔ مطبوعہ، نولکشور، لکھنو ۱۸۹۶ء۔ ۱۹۰۷ء

۱۲۔ یہ تصنیف شائع نہیں ہوئی، اس کا متن انگریزی میں ولیم ہوے (William Hoey) نے ترجمہ کیا تھا: Memoris of Delhi and Faizabad. (الہ آباد، ۱۸۸۸ء)۔

۱۳۔ محمد تقی احمد علوی ''تاریخ اودھ کے بعض قابل قادر مآخذ'' مشمولہ ''مقالات تاریخ ہند'' مرتبہ و مطبوعہ، خدا بخش اورینٹل لائبریری'' بہ سلسلۂ انتخاب الناظر'' ۲، پٹنہ، ۲۰۰۱ء

۱۴۔ ولادیمیر ایوانوف Concise Discriptive Catalogue of the persian Manuscripts. مخزونہ ایشیاٹک سوسائٹی بنگال ذخیرۂ کرزن (کلکتہ، ۱۹۲۶ء) ص ۹۲، لیکن رچرڈ بی بارے نے اس کا نام ''احوال زندگی فیض بخش'' تحریر کیا ہے اور اسے مصنف کی خودنوشت نوانح عمری بتایا ہے، بحوالہ North India Between Empires: Awadh, Mughals,and the British (دہلی، ۱۹۸۷ء) ص ۲۵۶

۱۵۔ مطبوعہ مطبع مفید عام، آگرہ، ۱۸۷۳ء

۱۶۔ ص ۱۵، ۱۷، اپنے خود نوشت حالات اور اجداد کا ذکر ایک اور جگہ بھی انھوں نے تحریر کیا تھا، جو ایک ''گلدستۂ شعر و سخن'' (آگرہ، ۱۸۶۹ء) میں ایک مشاعرے کی روداد میں شائع ہوا تھا، بحوالہ و مشمولہ ''تلاش و تعارف'' مصنفہ ڈاکٹر حنیف نقوی (لکھنو، ۱۹۸۷ء) ص ۱۴۷، ۱۵۶، ۱۵۷

۱۷۔ یہ تصنیف شائع نہیں ہوئی۔ اس کے دو قلمی نسخے عبدالرحمٰن بارکر (کینیڈا) کے ذاتی ذخیرے میں تھے، جو اب کوالالمپور، کے ''بین الاقوامی ادارۂ اسلامی فکر و تہذیب'' Int'l Institute of Islamic Civilization and Thought کے کتب خانے میں منتقل ہو گئے ہیں۔ بحوالہ حاجی علی بن حاجی احمد Catalogue of the Persian Manuscripts in the Library of the Int'l Institute of Islamic Civilization and Thought. (کوالالمپور، ۱۹۹۴ء) ص ۳۳، ۴۷ راقم الحروف نے دسمبر ۲۰۰۳ء میں ان دونوں نسخوں سے استفادہ کیا ہے۔ اس تاریخ کا ایک تجزیاتی مطالعہ، ساجدہ ایس علوی An Unknown Source for the History of Awadh:Tarikh-i-Husyniyah. مشمولہ Der Islam: جلد ۵۸، شمارہ ۱، ۱۹۸۱ء، ص ۱۳۶۔ ۱۴۶ میں موجود ہے۔

۱۸۔ مصنف نے اسے ۱۸۰۳ء میں اپنے سفر سے واپسی کے بعد ۱۸۰۴ء۔ ۱۸۰۵ء میں تحریر کیا تھا جو ۱۸۱۲ء میں کلکتہ میں مرزا حسین علی اور میر قدرت علی کے اہتمام سے شائع ہوا۔ اس کا انگریزی ترجمہ Travels of Abu Taleb Khan in Asia, Africa and Europe. فارسی میں اشاعت سے قبل ہی، چارلس اسٹورٹ نے ۱۸۱۱ء میں دو جلدوں میں لندن میں شائع کر دیا تھا۔

۱۹۔ یہ سفر نامہ ۱۷۸۵ء میں فارسی میں لکھا گیا تھا، لیکن تا حال اصل متن شائع نہیں ہوا۔ پہلے پہل اس کا ترجمہ بیک وقت انگریزی اور اردو میں لندن سے جے ای الیگزنڈر نے ۱۸۲۷ء میں شائع کیا۔ Shigurf Namah-i-Velaet...or Travels of Mirza Itesa Modeen.... مترجم نے یہ نشاندہی نہیں کی

کہ اردو میں ترجمہ کس نے کیا۔ بعد میں اس کے اردو ترجمے، محبّ اللہ (کراچی، سن ندارد) اور امیر حسن نورانی نے کیے (پٹنہ، ۱۹۹۵ء)۔

۲۰۔ یہ غیر مطبوعہ ہے اور سائمن ڈگبی کے ذخیرہ کتب (انگلستان) میں محفوظ ہے۔ تفصیلات کے لیے: سائمن ڈگبی، An Eighteenth Century Narrative of a Journey from Bengal to England: Munshi Ismail's New History. مشمولہ: کرسٹوفر شیکل Urdu and Muslim South Asia: Studies in Honour of Ralth Russell (لندن، ۱۹۸۹ء)، ص ۴۹-۶۵۔

۲۱۔ ''واقعاتِ اظفری''، اصل فارسی متن (مدراس، ۱۹۵۸ء)، اردو ترجمہ، عبدالستار اور محمد حسین محوی صدیقی (مدراس، ۱۹۳۷ء) و نیز تلخیص و تجزیہ، سید علی عباس، ''اظفری گورگانی اور ان کا ریختہ کلام'' (لاہور، سنہ ندارد) اس طرح کے سفرناموں میں جو ہندوستانیوں نے تحریر کیے اور ان میں لکھنو سے راست اپنے تعلق کا اظہار بھی کیا یا لکھنو بھی گئے اور وہاں کے حالات بھی تحریر کیے، ان میں ایک محمد بقا کے سفر رامپور تا لکھنو اپریل تا اکتوبر کے واقعات تھے، جس کا انگریزی ترجمہ ولیم یالے نے کیا تھا، بحوالہ اسٹوری، تصنیف مذکورہ، ص ۱۱۴۶، غلام محمد خان کا سفرنامہ ''نوادر القصص'' بھی اسی نوعیت کا حامل تھا، جس کا مصنف شجاع الدولہ کی ملازمت میں بھی رہا۔ بحوالہ ایضاً، ص ۱۱۴۷۔

۲۲۔ مطبوعہ، تہران ۱۳۶۳ش۔

۲۳۔ مرتبہ شائستہ خان (پٹنہ ۱۹۹۲ء)۔

۲۴۔ سید حسن نے اس تصنیف سے استفادہ کرتے ہوئے تین مقالے تحریر کیے: (۱) ''لکھنو سوا سو برس پہلے''، (۲) ''لکھنو کے چند نامور شعراء، ایک نادر روزنامچے کی روشنی میں''، اور (۳) ''آتش سے نجات حسین خاں کی ملاقات''، مشمولہ: ''چند تحقیقی مقالے'' (پٹنہ، ۱۹۷۶ء)۔

۲۵۔ مطبوعہ، لکھنو، ۱۹۲۹ء

۲۶۔ ترتیب و تصحیح، عابد رضا بیدار، (رامپور، ۱۹۶۵ء)، اس کا اردو ترجمہ ثروت علی نے ''تاریخ آصفی'' کے نام سے (دہلی، ۱۹۶۸ء) اور انگریزی ترجمہ ولیم ہوئے (W.Hoey) نے History of Asafuddaulah. کے نام سے کیا تھا (الہ آباد، ۱۸۸۵ء)۔

۲۷۔ مشفق خواجہ ''جائزہ مخطوطات اردو'' جلد اول (لاہور، ۱۹۷۹ء) ص ۲۸۳-۲۸۷

۲۸۔ مطبوعہ کندن لال پریس، لکھنو، ۱۹۱۸ء

۲۹۔ مکتبہ نیا راہی، کراچی، ۱۹۵۸ء

۳۰۔ مطبوعہ، مکتبہ سلطانی، کلکتہ، ۱۸۷۷ء

۳۱۔ اس کا زیادہ بہتر متن محمد اکرام چغتائی نے مرتب کیا ہے، لاہور، ۱۹۹۹ء

۳۲۔ مرتبہ و مطبوعہ، لکھنو ۱۹۵۴ء

۳۳۔ مشمولہ: ''خدا بخش لائبریری جرنل'' (پٹنہ، نمبر ۵۶، ۱۹۹۰ء)۔

۳۴۔ ایضاً، ص ۲۳۵-۲۳۶، ۲۴۳-۲۴۴

۳۵۔ ایضاً ص ۲۸۳

۳۶۔ انیسویں صدی میں لکھی گئی اردو خودنوشت سوانح عمریوں کا ایک تحقیقی جائزہ ''اردو کی اولین خودنوشت سوانح عمریاں'' مصنفہ معین الدین عقیل، مشمولہ ''خدابخش لائبریری جرنل'' (شمارہ ۱۳۵، جنوری ۲۰۰۴ء) ص ۵۷۔۷۰ میں دیکھا جا سکتا ہے۔

۳۷۔ اولین اشاعت: لندن ۱۸۳۱ء، اشاعت ثانی: مطبع مفاد ہند، بنارس ۱۸۵۱ء

۳۸۔ مصححہ متن، مرتبہ نثار احمد فاروقی، دہلی، ۱۹۹۶ء و نیز ایک عمدہ تجزیے اور مطالعے کے لیے: انگریزی ترجمہ اور تعلیقات، سی ایم نعیم Zikr-i-Mir (آکسفورڈ، دہلی، ۱۹۹۹ء)۔

۳۹۔ اسٹوری، تصنیف مذکور ص ۶۱۶۔۶۱۷، اس آپ بیتی کی تین نقلیں انڈیا آفس لندن کے کتب خانے میں محفوظ ہیں، ایضاً۔

۴۰۔ ان کا ایک منتخب مجموعہ ''لکھنو رشک روضۂ رضواں'' مرتبہ: مرزا محمد باقر لکھنوی (کراچی، سنہ ندارد) و نیز ''شہر آشوب'' مرتبہ ڈاکٹر نعیم احمد (دہلی، ۱۹۶۸ء)۔

۴۱۔ مرتبہ: سید محمود نقوی، دہلی ۱۹۸۵ء

۴۲۔ مرتبہ: ڈاکٹر نیر مسعود رضوی، مشمولہ: ''اردو'' کراچی شمارہ ۴، اکتوبر ۱۹۸۹ء، شمارہ ۱، جنوری ۱۹۹۰ء

۴۳۔ مرتبہ: ڈاکٹر عبارت بریلوی، لاہور ۱۹۷۳ء

۴۴۔ ان کے چند نمونے ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی نے نظم و نثر میں یکجا کیے ہیں: ''لکھنوئی ادب، ۱۸۵۷ء کے متعلق''، مشمولہ: ''لکھنو اور جنگ آزادی'' مرتبہ ادبی اکیڈمی لکھنو، ۱۹۵۷ء، ص ۱۱۱، ۱۳۶

۴۵۔ یہ مطبع نولکشور لکھنو سے پہلی بار ۱۸۹۴ء میں اور دوسری بار ۱۹۱۸ء میں شائع ہوئی تھی۔

۴۶۔ ''ناول کی تاریخ و تنقید'' (لاہور، ۱۹۶۴ء) ص ۳۴۲۔۳۴۳

۴۷۔ معین الدین عقیل، محولہ بالا ص ۵۹۔ و بعدہ۔

۴۸۔ مرتبہ: ڈاکٹر عبدالسبحان (کلکتہ، ۱۹۸۶ء)۔

۴۹۔ ''تاریخ عجیبہ المعروف بہ کالا پانی'' (لاہور، ۱۸۹۰ء)۔

۵۰۔ ان معلومات کے لیے، معین الدین عقیل، محولہ بالا، اس عرصے میں ایک اور خودنوشت سوانح عمری ''بیتی کہانی'' مصنفہ شہر بانو بیگم بھی ۱۸۸۵ء میں لکھی جا چکی تھی لیکن یہ شائع نہ ہو سکی تھی، اور نہ اس کے بارے میں کسی کو علم تھا۔ راقم الحروف کے تعارف کے ساتھ یہ ۱۹۹۶ء میں شعبۂ اردو، سندھ یونیورسٹی کے اہتمام سے منظر عام پر آئی اور پھر خاصے اضافوں کے ساتھ ۲۰۰۳ء میں اسے مکتبۂ تعمیر انسانیت، لاہور نے شائع کیا۔